

تقسیم وراثت

[۱]

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ
وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ، حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ - فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى
الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ، إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ - فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوَصٍّ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ
بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ، إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ - (البقرہ ۲: ۱۸۰-۱۸۲)

”تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ پہنچے اور وہ کچھ مال چھوڑ رہا ہو تو تم پر لازم ہے کہ والدین اور قرابت مندوں کے
لیے دستور کے مطابق وصیت کرو۔ خدا سے ڈرنے والوں پر یہ حق ہے۔ پھر جو اس وصیت کو اس کے سننے کے بعد بدل
ڈالے تو اس کا گناہ اُن بدلنے والوں پر ہی ہوگا۔ بے شک، اللہ سمیع و علیم ہے۔ جس کو البتہ، کسی وصیت کرنے والے کی
طرف سے جانب داری یا حق تلفی کا اندیشہ ہو اور وہ آپس میں صلح کر اے تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ بے شک، اللہ غفور
رحیم ہے۔“

سورہ نساء میں تقسیم وراثت کی جو آیات اس کے بعد زیر بحث آئیں گی، ان میں حصوں کی تعیین اور مصحف میں ان کی جگہ
صاف بتاتی ہے کہ والدین اور قرابت مندوں کے لیے دستور کے مطابق وصیت کا یہ حکم اُس وقت نازل ہوا جب وہ آیات
ابھی نازل نہیں ہوئی تھیں۔ نساء کی اُن آیات میں یہ بات بھی واضح کر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میت کے ترکہ میں والدین
اور اقربا کے حصے اس لیے متعین فرمائے ہیں کہ انسان نہیں جانتا کہ ان میں سے کون بہ لحاظ منفعت اس سے قریب تر ہے۔ پھر
اللہ تعالیٰ نے وہاں ان حصوں کو اپنی وصیت قرار دیا ہے جس کے مقابلے میں ظاہر ہے کہ کسی مسلمان کو اپنی کوئی وصیت پیش
کرنے کی جسارت نہیں کرنی چاہیے۔ نساء کی آیت میں ’لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ
وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ، نَصِيبًا مَّفْرُوضًا‘ کے الفاظ بھی اسی بات
پر دلالت کرتے ہیں۔ لہذا یہ بات تو بالکل قطعی ہے کہ سورہ بقرہ کی اس آیت کا حکم منسوخ ہو گیا ہے، لیکن یہ جب دیا گیا تو اس
سے کیا چیز پیش نظر تھی؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی اس سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

۴۰: ۷، ”والدین اور اقربا جو کچھ چھوڑیں، اس میں مردوں کا بھی ایک حصہ ہے اور والدین اور اقربا جو کچھ چھوڑیں، اس میں عورتوں کا
بھی ایک حصہ ہے، خواہ یہ تھوڑا ہو یا بہت، ایک متعین حصے کے طور پر۔“

”اس آیت میں والدین اور اقربا کے لیے جو وصیت کا حکم دیا گیا، وہ معروف کے تحت تھا اور اس عبوری دور کے لیے تھا جب کہ اسلامی معاشرہ ابھی اس استحکام کو نہیں پہنچا تھا کہ تقسیم وراثت کا وہ آخری حکم دیا جائے جو سورہ نساء میں نازل ہوا۔ اس حکم کے نزول کے لیے حالات کے سازگار ہونے سے پہلے یہ عارضی حکم نازل ہوا اور اس سے دو فائدے پیش نظر تھے: ایک تو فوری طور پر ان حصہ داروں کے حقوق کا ایک حد تک تحفظ جن کے حقوق عصبات کے ہاتھوں تلف ہو رہے تھے، اور دوسرے اس معروف کو از سر نو تازہ کرنا جو شرفائے عرب میں زمانہ قدیم سے معتبر تھا، لیکن اب وہ آہستہ آہستہ جاہلیت کے گردوغبار کے نیچے دب چلا تھا تا کہ یہ معروف اس قانون کے لیے ذہنوں کو ہموار کر سکے جو اس باب میں نازل ہونے والا تھا۔“

(تذکرہ قرآن ۱/۲۳۹-۲۴۰)

[۲]

ا- يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ، لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثِيَيْنِ، فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ، وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ۔ (النساء: ۱۱)

”تمھاری اولاد کے بارے میں اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔ پھر اگر اولاد میں لڑکیاں ہی ہوں اور وہ دو سے زیادہ ہوں تو انھیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کے لیے آدھا ہے۔“

سورہ نساء میں تقسیم وراثت کا یہی حکم ہے جس سے اوپر کی آیت کا حکم منسوخ ہوا ہے۔ اس میں سب سے پہلے اولاد کے حصے بیان ہوئے ہیں۔

’يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ‘، یہ جملہ ’لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثِيَيْنِ‘ کے لیے بطور تمہید آیا ہے۔ ’اولاد‘ کا لفظ، ظاہر ہے کہ مرد و عورت دونوں کے لیے عام ہے۔ چنانچہ تالیف کلام اس طرح ہوگی: ’لِلذَّكَرِ مِنْهُمْ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثِيَيْنِ‘، یعنی اللہ تم کو تمھاری اولاد کے بارے میں ہدایت کرتا ہے، ان میں سے لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہوگا۔

یہ حکم اگر ’لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثِيَيْنِ‘ ہی پر ختم ہو جاتا تو اس کے معنی یہ تھے:

۱۔ مرنے والے کی اولاد میں اگر ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہی ہو تو لڑکے کو لڑکی کا دو نالے گا۔

۲۔ لڑکے اور لڑکیاں اس سے زیادہ ہوں تو میت کا ترکہ اس طرح تقسیم کیا جائے گا کہ ہر لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر رہے۔

۳۔ اولاد میں صرف لڑکے یا لڑکیاں ہی ہوں تو سارا ترکہ دونوں میں سے جو موجود ہوگا، اسے دیا جائے گا۔

یہ تیسری بات بھی صاف واضح ہے کہ اس اسلوب کا لازمی تقاضا ہے۔ ہم اگر اپنی زبان میں یہ کہیں کہ یہ رقم فقیروں کے لیے ہے اور اس میں سے فقیر مرد کا حصہ دو فقیر عورتوں کے برابر ہوگا تو اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ رقم درحقیقت فقیروں کے لیے

دی گئی ہے، لہذا ان میں اگر فقیر مرد ہی ہوں گے تو ساری رقم ان میں تقسیم کر دی جائے گی اور فقیر عورتیں ہی ہوں گی تو پھر بھی یہی کیا جائے گا۔ لیکن حکم یہاں ختم نہیں ہوا، بلکہ اس سے متصل ایک استثناء کے ذریعے سے قرآن نے وضاحت کر دی ہے کہ اس کا منشا یہ نہیں ہے۔

’فان كن نساء فوق اثنتين فلهن ثلثا ما ترك‘، یہ ’لذکر مثل حظ الانثیین‘ سے استثناء ہے۔ یعنی مرنے والے کی اولاد میں اگر لڑکیاں ہی ہوں تو خواہ دو ہوں یا دو سے زائد، ان کا حصہ ہر حال میں دو تہائی ہی ہوگا۔

’وان كانت واحدة فلها النصف‘ یہ اسی پر عطف ہوا ہے۔ یعنی اگر ایک ہی لڑکی ہے تو وہ نصف کی حق دار ہوگی۔ ’فوق اثنتين‘ کا مفہوم ہم نے اوپر دو یا دو سے زائد بیان کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے، ہمارے نزدیک ’اثنتين‘ کا لفظ عربیت کی رو سے محذوف ہے۔ قرآن کی زبان میں اگر ہم ایک لڑکی اور دو یا دو سے زائد لڑکیوں کا حصہ ان کے حصوں میں فرق کی وجہ سے الگ الگ بیان کرنا چاہیں تو اس کے دو طریقے ہیں: ترتیب صعودی کے مطابق بیان کرنا پیش نظر ہو تو پہلے ایک لڑکی اور اس کے بعد دو لڑکیوں کا حصہ بیان کیا جائے گا۔ دو سے زائد کا حصہ اگر وہی ہے جو دو کا ہے تو اسے لفظوں میں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک کے فوراً بعد جب دو کا حصہ اس طرح بیان کیا جائے کہ وہ ایک کے حصے سے زیادہ ہو تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ دو سے زائد کا حکم بھی وہی ہے جو دو لڑکیوں کا ہے۔ اسی بات کو ہم ترتیب نزولی کے مطابق بیان کریں گے تو اس کے لیے ’فوق اثنتين‘ اور ’اثنتين‘ کے الفاظ چونکہ عربیت کی رو سے موزوں نہ ہوں گے، اس لیے دو سے زائد کا حصہ بیان کرنے کے بعد ایک کا حصہ بیان کر دیا جائے گا۔ اس اسلوب میں ’فوق اثنتين‘ سے کلام کا آغاز خود دلیل ہوگا کہ اس سے پہلے ’اثنتين‘ کا لفظ محذوف ہے۔ غور کیجیے تو اس کا قرینہ بالکل واضح ہے۔ اس ترتیب کا حسن مقضیٰ ہے کہ ’فوق اثنتين‘ سے پہلے ’اثنتين‘ کا لفظ استعمال نہ کیا جائے اور صحت زبان کا تقاضا ہے کہ ’فوق اثنتين‘ سے بات شروع کی جائے تو بعد میں ’اثنتين‘ مذکور نہ ہو۔ قرآن مجید نے یہ حصے یہاں ترتیب نزولی کے مطابق بیان کیے ہیں، اس لیے حذف کا یہ اسلوب ملحوظ ہے۔ سورہ نساء کی آخری آیت میں یہی حصے ترتیب صعودی کے مطابق بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ دیکھ لیجیے، وہاں ’اثنتين‘ کے بعد ’فوق اثنتين‘ کا لفظ حذف کر دیا گیا ہے: ’ان امرؤ هلك ليس له ولد وله اخت فلها نصف ما ترك‘، وهو يرثها، ان لم يكن لها ولد، فان كانتا اثنتين فلهما الثلثان مما ترك‘۔

۲۔ وَلَا بَوَيْهَ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا الشُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ، فَإِنْ لَّمْ يَكُنْ لَهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبُوهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ، فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ الشُّدُسُ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ۔ (النساء: ۱۱)

”اور اگر میت کے اولاد نہ ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کے لیے ترکے کا چھٹا حصہ ہے اور اگر اس کے اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کا حصہ ایک تہائی ہے، اور اگر اس کے بہن بھائی ہوں تو ماں کے لیے وہی چھٹا حصہ ہے، جب کوئی وصیت جو مرنے والے نے کی ہو، وہ پوری کر دی جائے اور قرض اگر اس نے چھوڑا ہو، وہ ادا کر دیا جائے۔“

اولاد کے بعد یہ اب والدین کے حصے بیان ہوئے ہیں:

’ولا بویہ لكل واحد منهما السدس مما ترک‘، یہ جملہ ’فان کن نساء اور وان کانت واحدة‘ پر نہیں، بلکہ اس پورے حکم پر عطف ہوا ہے جو اوپر اولاد کے لیے بیان ہوا ہے۔ چنانچہ اس میں عطف اب جمع کے لیے نہیں ہوگا، اسے استدراک ہی کے لیے مانا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ’لذکر مثل حظ الانثیین‘ میں یہ بات تو بیان ہوئی ہے کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہوگا، لیکن یہ کتنا ہوگا، اسے متعین نہیں کیا گیا۔ یہ اسی طرح کا اسلوب ہے، جس طرح مثال کے طور پر ہم اپنی زبان میں یہ کہیں کہ — ”یہ روپے بچوں کے لیے ہیں، لڑکوں کو لڑکیوں سے دو نا دیجیے، اور اس میں سے آدھی رقم آپ کے ابا کے لیے ہے“ — ان جملوں کو دیکھیے، ان سے قائل کا مدعا بالکل واضح ہے۔ جو شخص بھی زبان آشنا ہو گا، وہ ان سے یہی مطلب سمجھے گا کہ روپے درحقیقت بچوں کے لیے دیے گئے ہیں، اس لیے بات اگر پہلے دو جملوں ہی پر ختم ہو جاتی تو ساری رقم لڑکوں اور لڑکیوں میں اسی نسبت سے تقسیم کر دی جاتی جو ان جملوں میں بیان ہوئی ہے، لیکن قائل نے اس کے بعد چونکہ آدھی رقم ابا کو دینے کے لیے کہا ہے، اس وجہ سے یہ ضروری ہے کہ ابا کا حصہ پہلے دیا جائے اور باقی جو کچھ بچے، وہ اس کے بعد بچوں میں تقسیم کیا جائے۔ ہم نے اوپر اولاد کے حصوں کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ ’فان کن نساء‘ ’لذکر مثل حظ الانثیین‘ سے استثناء اور اسی کے ایک پہلو کی وضاحت ہے۔ ہماری یہ بات اگر صحیح ہے تو اسے پھر ’ولا بویہ‘ کی طرح اپنے مقام پر مستقل نہیں مانا جا سکتا۔ اس کا حکم وہی ہونا چاہیے جو ’لذکر مثل حظ الانثیین‘ کا ہے۔ یہ اسی طرح کی بات ہے، جس طرح مثلاً ہم یہ کہیں کہ — ”یہ ساری رقم زید، عثمان اور علی کے لیے ہے اور اس میں ان کا حصہ بالکل برابر ہے، لیکن اگر عثمان اور علی ہی ہوں تو پوری رقم کا دو تہائی عثمان اور ایک تہائی علی کو دیجیے، اور اس میں سے دس روپے ہماری بہن کو دے دیجیے گا“ — ان جملوں پر غور کیجیے، ان میں اگرچہ زید کی عدم موجودگی میں عثمان اور علی کو بالترتیب پوری رقم کا دو تہائی اور ایک تہائی دینے کے لیے کہا گیا ہے، لیکن ان کے خاتمہ پر جو استدراک ہوا ہے، اس کا لازمی تقاضا ہے کہ اس رقم میں سے پہلے دس روپے بہن کو دیے جائیں، اور اس کے بعد جو کچھ بچے، وہ عثمان اور علی میں ان کے حصوں کے مطابق تقسیم کر دیا جائے۔

یہی اسلوب آیہ زیر بحث میں بھی ہے۔ چنانچہ یہ اگر ملحوظ رہے تو اس بات کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی کہ ’وان کانت واحدة فلها النصف‘ کے بعد والدین اور زوجین کے جو حصے حرف ’و‘ سے اولاد کے حصوں پر عطف ہوئے ہیں، وہ سب

لازمًا پہلے دیے جائیں گے اور اس کے بعد جو کچھ بچے گا، صرف وہی اولاد میں تقسیم ہوگا۔ لڑکے اگر تنہا ہوں تو انھیں بھی یہی ملے گا اور لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوں تو ان کے لیے بھی یہی قاعدہ ہوگا۔ اسی طرح میت کی اولاد میں اگر تنہا لڑکیاں ہی ہوں تو انھیں بھی اس بچے ہوئے ترکے ہی کا دو تہائی یا آدھا دیا جائے گا، ان کے حصے پورے ترکے میں سے کسی حال میں ادا نہ ہوں گے۔

آیت کا صحیح مدعا یہی ہے۔ جو شخص بھی ’و لا بسویہ‘ میں حرف ’و‘ اور ’فان کن نساء‘ میں حرف ’ف‘ کی دلالت کو سمجھتے ہوئے اس آیت کو پڑھے گا، کلام کا یہ مدعا بغیر کسی تکلف کے اس پر واضح ہو جائے گا۔
اس کے بعد اب آیت کا باقی حصہ دیکھیے:

’ان کان له ولد‘ اور ’فان لم یکن له ولد‘ میں ’ولد‘ کا لفظ ذکور و اناث، دونوں کے لیے عام ہے۔ عربی زبان میں یہ اس معنی میں معروف ہے۔ یہ لفظ یہاں اور ازواج کے حصوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ ہمارے نزدیک ہر جگہ اس کا مفہوم یہی ہے۔ اہل لغت بالصراحت کہتے ہیں کہ: ’هو یقع علی الواحد و الجمع والذکر والانثی‘۔ ان آیات میں اسے اولاد ذکور کے لیے خاص کرنے کا کوئی قرینہ نہیں ہے۔ لڑکا لڑکی ایک ہوں یا دو، اولاد میں صرف لڑکے ہوں یا صرف لڑکیاں ہوں، نفی و اثبات میں اس شرط کا اطلاق بہر حال ہوگا۔

’فلامہ الثلث‘ کے بعد Erbیت کے قاعدے کے مطابق ’و لا بیہ الثلثان‘ یا اس کے ہم معنی الفاظ محذوف ہیں۔ اس محذوف کا قرینہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے اس تقسیم کے لیے ’و ورثہ ابواہ‘ کی شرط عائد کی ہے۔ اس طرح یہ مذکور محذوف پر خود دلیل بن گیا ہے۔ ہم اگر یہ کہیں کہ: ’اس رقم کے وارث زید اور علی ہی ہوں تو زید کا حصہ ایک تہائی ہوگا‘ — تو اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ — ’باقی دو تہائی علی کے لیے ہے۔‘

’فان کان له اخوة فلامہ السدس‘ کے بعد بھی ہمارے نزدیک ’و لا بیہ‘ یا اس کے ہم معنی الفاظ حذف ہو گئے ہیں۔ اس کا قرینہ بھی بالکل واضح ہے۔ بھائی بہن موجود ہوں تو ماں کا حصہ وہی ہے جو اوپر اولاد کی موجودگی میں بیان ہوا ہے۔ یہ مذکور اس بات پر خود دلیل ہے کہ باپ کا حصہ بھی وہی ہونا چاہیے۔ اس کو الفاظ میں بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ پڑھنے والا قرآن کی زبان کا ذوق رکھتا ہو تو بغیر کسی تکلف کے سمجھ لے گا کہ ماں کا حصہ اصل کی طرف لوٹ گیا ہے تو باپ کا حصہ خود بخود لوٹ جائے گا۔

اس کلام کی تالیف اس طرح ہے:

’اولاد ہو تو ماں باپ میں سے ہر ایک کے لیے ۱/۶ ہے۔ اولاد نہ ہو اور والدین ہی وارث ہوں تو ماں کے لیے ۱/۳، لیکن اگر بھائی بہن ہوں تو ماں کے لیے وہی ۱/۶۔‘

دیکھ لیجیے، کلام خود پکار رہا ہے کہ — ”اور باپ کے لیے بھی وہی ۱/۶۔“

اس حکم سے واضح ہے کہ اولاد کی غیر موجودگی میں اللہ تعالیٰ نے بہن بھائیوں کو ان کا قائم مقام ٹھہرایا ہے۔ ہماری اس رائے کی تائید اسی سورہ کی آخری آیت سے بھی ہوتی ہے، لیکن اس کی وضاحت ہم آگے اس کے محل میں کریں گے۔

’اخوة‘ کا لفظ اس آیت میں، ہمارے نزدیک محض وجود پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ بھائی بہنوں کی موجودگی میں، عام اس سے کہ وہ ایک ہوں یا دو یا دو سے زیادہ ہوں، والدین کا حصہ اپنی اصل کی طرف لوٹ جائے گا۔ اس طرح کے اسلوب میں جمع بیان عدد کے لیے نہیں، محض بیان وجود کے لیے آتی ہے۔ ایک حماسی کا شعر ہے:

ایاک والامر الذی ان توسعت مواردہ ضاقت علیک المصادر

”اس معاملے سے بچو جس میں داخل ہونے کے راستے اگر کشادہ ہیں تو نکلنے کی راہیں تنگ ہوں۔“

شاعر نے یہاں ’موارد‘ اور ’مصادر‘ کے الفاظ جمع استعمال کیے ہیں۔ بڑا ستم کرے گا وہ شخص جو اس کا مفہوم یہ بیان کرے کہ اس شعر میں ایک ایسے معاملے سے بچنے کے لیے کہا گیا ہے جس کے موارد اور مصادر بہر حال تین یا تین سے زیادہ ہوں۔ اس شعر سے معاملے میں مورد و مصدر کا وجود تو بے شک ثابت ہوتا ہے، لیکن یہ واضح ہے کہ ان کی تعداد کا تعین شاعر کے پیش نظر ہی نہیں ہے۔ کسی معاملے میں ہاتھ ڈالنے اور اس سے الگ ہو جانے کا طریقہ ایک بھی ہو سکتا ہے اور یہ طریقے دس بیس بھی ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح مرنے والا اپنے پیچھے ایک بھائی یا بہن چھوڑ کر بھی رخصت ہو سکتا ہے اور اس کے بہن بھائی پانچ دس بھی ہو سکتے ہیں۔ ’اخوة‘ کا لفظ ان سب صورتوں کا احاطہ کر لیتا ہے۔ اس مفہوم کے لیے جمع کا یہ اسلوب ہر زبان میں عام ہے۔ ہم اگر یہ کہیں کہ — ”آپ کے ہاں بچے ہوں تو یہ مٹھائی ان کو دے دیجیے گا“ — تو کوئی شخص اس سے یہ مراد نہیں لے گا کہ اگر مخاطب کے ایک ہی بچہ ہو تو چونکہ متکلم نے لفظ ”بچے“ جمع استعمال کیا ہے، اس لیے وہ کسی حال میں مٹھائی کا حق دار نہیں ہو سکتا۔ اس جملے کا یہ مطلب وہی شخص لے سکتا ہے جو زبان کو اسالیب بیان کے بجائے منطق اور ریاضی کے اصولوں سے سمجھتا ہو۔

’من بعد وصیة یوصی بها او دین‘ حکم کے آخر میں اس ہدایت کا منشا یہ ہے کہ اگر میت کے ذمہ قرض ہو تو سب سے پہلے اس کے تر کے میں سے وہ دیا جائے گا۔ پھر اگر کوئی وصیت مرنے والے نے کی ہو تو وہ پوری کی جائے گی اور اس کے بعد وراثت تقسیم ہوگی۔ آیت میں قرض اگرچہ لفظاً موخر ہے، لیکن حکم کے لحاظ سے اسے مقدم ہی مانا جائے گا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قرض خواہ کا حق مرنے والے کی زندگی ہی میں قائم ہو جاتا ہے اور جن کے لیے وصیت کی گئی ہے، ان کا حق مورث کی موت سے پہلے قائم نہیں ہوتا۔ رہی آیت میں وصیت کی تقدیم تو یہ محض حسن بیان کے لیے ہے۔

۳۔ آبَاؤْكُمْ وَ اَبْنَاؤْكُمْ ، لَا تَذَرُوْنَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ، فَرِیْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ، اِنَّ

اللَّهُ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا - (النساء: ۱۱)

”تم نہیں جانتے کہ تمہارے والدین اور تمہاری اولاد میں سے کون بہ لحاظِ منفعت تم سے قریب تر ہے۔ یہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا فریضہ ہے۔ بے شک، اللہ علیم و حکیم ہے۔“

سلسلہ کلام کے بیچ میں یہ آیت جس مقصد کے لیے آئی ہے، وہ یہ ہے کہ لوگوں پر یہ بات واضح کر دی جائے کہ جن رشتہ داروں کو اللہ تعالیٰ نے کسی میت کے وارث قرار دیا ہے، ان کے بارے میں مبنی برانصاف قانون وہی ہے جو اس نے خود بیان فرما دیا ہے۔ چنانچہ اس کی طرف سے اس قانون کے نازل ہو جانے کے بعد اب کسی مرنے والے کو اللہ کے ٹھہرائے ہوئے ان وارثوں کے حق میں وصیت کا اختیار باقی نہیں رہا۔ یہ تقسیم اللہ کے علم و حکمت پر مبنی ہے۔ اس کے ہر حکم میں گہری حکمت ہے اور اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ انسان اپنی بلند پروازیوں کے باوجود اس کے علم کی وسعتوں کو پاسکتا ہے اور نہ اس کی حکمتوں کو پوری طرح سمجھ سکتا ہے۔ وہ اگر بندہ مومن ہے تو اس کے لیے زیبا یہی ہے کہ اس کا حکم سنے اور اس کے سامنے سر جھکا دے۔

آیت کا اصل مدعا یہی ہے، لیکن اگر غور کیجیے تو اس سے یہ بات بھی نہایت لطیف طریقے سے واضح ہوگئی ہے کہ وراثت کا حق جس بنیاد پر قائم ہوتا ہے، وہ قرابتِ نافعہ ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ والدین، اولاد، بھائی، بہن، میاں بیوی اور دوسرے اقربا کے تعلق میں یہ منفعت بالطبع موجود ہے اور عام حالات میں یہ اسی بنا پر بغیر کسی تردد کے وارث ٹھہرائے جاتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی اگر اپنے مورث کے لیے منفعت کے بجائے سراسر اذیت بن جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے علتِ حکم کا یہ بیان تقاضا کرتا ہے کہ اسے وراثت سے محروم قرار دیا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کے پیش نظر جزیرہ نماے عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ کے بارے میں فرمایا:

لا يرث المسلم الكافر ولا الكافر المسلم - (بخاری، رقم ۶۷۶۴)
”نہ مسلمان ان میں سے کسی کافر کے وارث ہوں گے اور نہ یہ کافر کسی مسلمان کے۔“

یعنی اتمامِ حجت کے بعد جب یہ منکرینِ حق خدا اور مسلمانوں کے کھلے دشمن بن کر سامنے آ گئے ہیں تو اس کے لازمی نتیجے کے طور پر قرابت کی منفعت بھی ان کے اور مسلمانوں کے درمیان ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ چنانچہ یہ اب آپس میں ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔

اسی طرح یہ رہنمائی بھی ضمناً اس آیت سے حاصل ہوتی ہے کہ ترکے کا کچھ حصہ اگر بچا ہوا رہ جائے اور مرنے والے نے کسی کو اس کا وارث نہ بنایا ہو تو اسے بھی اقرب نفعاً ہی کو ملنا چاہیے۔
مسلم کی ایک روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی بات فرمائی ہے:

الحقوا الفرائض باهلها ، فما تركت الفرائض فهو لاولی رجل ذكر۔ (رقم ۱۲۱۵)

”وارثوں کو ان کا حصہ دو، پھر اگر کچھ بچے تو وہ قریب ترین مرد کے لیے ہے۔“

۴۔ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُنَّ وَلَدٌ ، فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمْ الرُّبْعُ مِمَّا تَرَكَنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِيَنَّ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ، وَلَهُنَّ الرُّبْعُ مِمَّا تَرَكَتُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ ، فَإِنْ كَانَ لَكُمْ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۔ (النساء: ۱۲)

”اور تمہاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو، اس کا نصف تمہیں ملے گا، اگر ان کے اولاد نہیں ہے۔ اور اگر وہ صاحب اولاد ہیں تو ترکے کا ایک چوتھائی حصہ تمہارا ہے جب کہ وصیت جو انھوں نے کی ہو، وہ پوری کر دی جائے اور قرض جو ان کے ذمہ ہو، وہ ادا کر دیا جائے۔ اور ان کے لیے تمہارے ترکے کا چوتھائی ہے، اگر تمہارے اولاد نہیں ہے اور اگر اولاد ہو تو تمہارے ترکے کا آٹھواں حصہ ان کا ہے، جب کہ وصیت جو تم نے کی ہو، وہ پوری کر دی جائے اور قرض جو تم نے چھوڑا ہو، وہ ادا کر دیا جائے۔“

یہ زوجین کے حصے ہیں اور ہر لحاظ سے واضح ہیں۔ ان میں لفظ ومعنی کے اعتبار سے کوئی مشکل نہیں ہے۔ ’ولا بسویہ‘ پر عطف کی وجہ سے مرنے والے کی وصیت کی تعمیل اور اس کا قرض ادا کر دینے کے بعد والدین کے حصوں کی طرح یہ حصے بھی پورے ترکے میں سے دیے جائیں گے۔

۵۔ وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوْ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ، فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْ ذَلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ ، غَيْرَ مُضَارٍّ ، وَصِيَّةً مِنَ اللَّهِ ، وَاللَّهُ عَلِيمٌ خَلِيمٌ ۔ (النساء: ۱۲)

”اور اگر کسی مرد یا عورت کو اس کے کلالہ تعلق کی بنا پر وارث بنایا جاتا ہے اور اس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہے تو بھائی اور بہن، ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اور اگر وہ اس سے زیادہ ہوں تو ایک تہائی میں سب شریک ہوں گے، جب کہ وصیت جو کی گئی ہو، وہ پوری کر دی جائے اور قرض جو ہو، وہ ادا کر دیا جائے، بغیر کسی کو ضرر پہنچائے۔ یہ وصیت ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ علیم و حلیم ہے۔“

اولاد، والدین اور زوجین کے بعد اب یہ دوسرے قرابت مندوں سے متعلق ہدایت فرمائی ہے۔ ’کلالہ‘ اس آیت میں اہم ترین لفظ ہے۔ اپنی اصل کے لحاظ سے یہ ’کلال‘، یعنی ضعف و عجز کے معنی میں مصدر ہے۔ اعثنیٰ کا مصرع ہے:

فآليت لا ارثي لها من كلاله

”تب میں نے قسم کھائی کہ میں اس پر اس کے ضعف و عجز کی وجہ سے رحم نہ کروں گا۔“

متمم بن نویرہ کہتا ہے:

فكانها بعد الكلالة والسرى
”وہ اونٹنی رات کے سفر اور تھکاوٹ کے بعد گویا وہ جنگلی گدھا ہے جس سے گا بھن گدھی بھی آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہے۔“

باعتبار مجاز ائمہ لغت نے بالعموم اس کے تین معنی بیان کیے ہیں:

ایک وہ شخص جس کے پیچھے اولاد اور والد دونوں میں سے کوئی نہ ہو،

دوسرے وہ قرابت جو اولاد اور والد کی طرف سے نہ ہو،

تیسرے کسی شخص کے وہ رشتہ دار جن کا تعلق اس کے ساتھ اولاد اور والد کا نہ ہو۔

زختری ”الکشاف“ میں لکھتے ہیں:

”کلالہ کے تین معنی ہیں: یہ اس شخص کے لیے اسم صفت

ہے جس کے پیچھے اولاد اور والد، دونوں میں سے کوئی

نہ ہو اور ان پس ماندگان کے لیے بھی جن کا تعلق

مرنے والے سے اولاد اور والد کا نہ ہو۔ اس کا اطلاق

اس قرابت پر بھی ہوتا ہے جو اولاد اور والد کی طرف سے

نہ ہو۔ عرب کہتے ہیں: ’ماورث المجد عن كلاله‘

(وہ دور کے تعلق سے بزرگی کا وارث نہیں ہوا)۔ اسی

طرح تم کہتے ہو: ’ما صمت عن عی‘ (وہ گفتگو میں

عاجز رہ جانے کی وجہ سے خاموش نہیں ہوا) اور

’ما كف عن جبن‘ (وہ بزدلی کی وجہ سے نہیں رکا)۔

اور کلالہ اصل میں بمعنی ’کلال‘، مصدر ہے اور ’کلال‘

کے معنی ہیں: عجز کی وجہ سے قوت کا جاتے رہنا۔ اعلیٰ کا

مصرع ہے: ’فآلیت لا ارثی لها من كلاله‘

(تب میں نے قسم کھائی کہ میں اس پر اس کے

ضعف و عجز کی وجہ سے رحم نہ کروں گا)۔ پھر یہ مجازی طور

پر اس قرابت کے لیے مستعمل ہوا جو والد اور اولاد

ینطلق علی ثلاثة: علی من لم

یخلف ولدا ولا والدا وعلی من

لیس بولد ولا والد من المخلفین و

علی القرابة من غیر جهة الولد

والوالد، و منه قولهم: ماورث

المجد عن كلاله کما تقول: ما

صمت عن عی و ما كف عن جبن۔

والكلالة فی الاصل مصدر بمعنی

الكلال وهو ذهاب القوة من الاعیاء،

قال الاعشى: فآلیت لا ارثی لها من

كلاله، فاستعیرت للقرابة من غیر

جهة الولد والوالد لانها بالاضافة

الی قرابتهما كالة ضعيفة، و اذا

جعل صفة للموروث او

الوارث فبمعنی ذی كلاله کما

تقول: فلان من قرابتی، ترید فلان

من ذوی قرابتی و یجوز ان یکون
صفة کالهجاجة والفقاعة
للاحق۔ (۲۸۵/۱)

اولاد کی طرف سے نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ
قرابت اس قرابت کی نسبت ضعیف ہے جو والد اور
اولاد کی طرف سے ہوتی ہے۔ اور اسے جب مورث یا
وارث کے لیے صفت قرار دیا جاتا ہے تو یہ ’ذو کلالہ‘
کے معنی میں ہوتا ہے۔ اسی طریقے پر تم ’فلان من
قرابتی‘ یعنی ’فلان من ذوی قرابتی‘ بولتے
ہو اور یہ ’هجاجة‘ اور ’فقاعة‘ بمعنی احمق کی طرح
اسم صفت بھی ہو سکتا ہے۔“

پہلے معنی، یعنی اس شخص کے لیے جس کے پیچھے اولاد اور والد، دونوں میں سے کوئی نہ ہو۔ اس کا استعمال اگرچہ اصولِ
عربیت کے مطابق ہے، لیکن اس کی کوئی نظیر کلامِ عرب میں ہم کو نہیں مل سکی۔
دوسرے معنی، یعنی اس قرابت کے لیے جو اولاد اور والد کی طرف سے نہ ہو، اس کے استعمال کے نظائر کلامِ عرب میں عام
ہیں۔

طراح کہتا ہے:

یہز سلاحا لم یرثہ کلالۃ
”وہ اپنا ہتھیار ہلاتا ہے جس کا وارث وہ دور کے تعلق سے نہیں ہوا۔ وہ اس سے اس کی رانوں کے چھپے ہوئے حصے کو چھید
ڈالتا ہے۔“

عامر بن طفیل کا مصرع ہے:

وما سود تنی عامر عن کلالۃ
”اور قبیلہ عامر نے مجھے دور کے تعلق کی وجہ سے سردار نہیں بنایا۔“

لسان العرب میں ہے:

والعرب تقول: لم یرثہ کلالۃ ای لم
یرثہ عن عرض، بل عن قرب
واستحقاق۔ (۵۹۲/۱۱)
”عرب کہتے ہیں: ’لم یرثہ کلالۃ‘ یعنی وہ دور
کے تعلق سے وارث نہیں ہوا، بلکہ اس نے وراثت
قرب واستحقاق کی وجہ سے پائی ہے۔“

تیسرے معنی، یعنی کسی شخص کے ان رشتہ داروں کے لیے جن کے ساتھ اس کا تعلق اولاد اور والد کا نہ ہو، اس کا استعمال قطعی
شواہد سے ثابت ہے:

حماسی شاعر یزید بن الحکم الثقفی اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے:

والمرء یبخل بالحقوق وللکلالۃ مایسیم

”انسان حقوق ادا کرنے میں بخل سے کام لیتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد اس کے جنگل میں چرنے والے جانور دور کے رشتہ دار لے جاتے ہیں۔“

ازہری نے ایک شاعر کا شعر نقل کیا ہے:

فان ابا المرء احمی له ومولی الکلالۃ لا یغضب
”آدمی پر ظلم کیا جائے تو اس کی حمایت میں اس کا باپ ہی سب سے بڑھ کر غضب ناک ہوتا ہے۔ کلالہ رشتہ دار آدمی کے لیے اس کے باپ کی طرح غضب ناک نہیں ہوتے۔“

ایک اعرابی کا قول ہے:

مالی کثیر و یرثنی کلالۃ متراخ
”میرے پاس مال بہت زیادہ ہے اور میرے وارث
نسبہم۔ (لسان العرب ۱۱/۵۹۲)

دور کے رشتہ دار ہیں۔“

امام مسلم نے جابر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ان کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

یا رسول اللہ، انما یرثنی کلالۃ۔
”اے اللہ کے رسول، میرے وارث صرف کلالہ
(رقم ۱۶۱۶) ہیں۔“

بہت سی تفسیری روایتوں میں بھی یہ معنی بیان ہوئے ہیں۔ ابوبکر بھصا ”احکام القرآن“ میں لکھتے ہیں:

وروی عن ابی ابکر الصدیق و علی
وابن عباس فی احدی الروایتین ان
الکلالۃ ماعدا الوالد والولد، وروی
محمد بن سالم عن شعبی عن ابن
مسعود انه قال: الکلالۃ ما خلا
الوالد والولد، و عن زید بن ثابت
مثله۔ (۸۷/۲)

”سیدنا ابوبکر صدیق، سیدنا علی اور حضرت ابن عباس
سے اس باب میں جو دو روایتیں ہیں، ان میں سے ایک
میں ہے کہ باپ اور اولاد کے سوا سب کلالہ ہیں اور محمد
بن سالم نے شعبی سے اور انھوں نے حضرت ابن مسعود
سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: باپ اور اولاد
کے سوا سب کلالہ ہیں۔ اور حضرت زید بن ثابت سے
بھی یہی معنی روایت ہوئے ہیں۔“

اب آیہ زیر بحث میں دیکھیے، جہاں تک پہلے معنی کا تعلق ہے، فقہانے اگرچہ یہاں بالاتفاق وہی مراد لیے ہیں، لیکن
آیت ہی میں دلیل موجود ہے کہ یہ معنی یہاں مراد لینا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔

غور فرمائیے، ”یوصیکم اللہ فی اولادکم“ سے جو سلسلہ بیان شروع ہوتا ہے، اس میں اولاد اور والدین کا حصہ بیان

کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے وصیت پر عمل درآمد کی تاکید من بعد وصیة یوصی بها او دین کے الفاظ میں کی ہے۔ زوجین کے حصوں میں اسی مقصد کے لیے من بعد وصیة یوصی بها او دین اور من بعد وصیة توصون بها او دین کے الفاظ آئے ہیں۔ تدبر کی نگاہ سے دیکھیے تو ان سب مقامات پر فعل بنی للفاعل (معروف) استعمال ہوا ہے اور یوصی، یوصین اور توصون میں ضمیر کا مرجع ہر جملے میں بالصراحت مذکور ہے۔ لیکن قرآن کا ایک طالب علم اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کر سکتا کہ کلام کے احکام میں یہی لفظ بنی للمفعول (مجهول) ہے۔ یہ تبدیلی صاف بتا رہی ہے کہ ان کان رجل یورث کلالۃ او امرأۃ میں یوصی کا فاعل، یعنی مورث مذکور نہیں ہے، اس وجہ سے اس آیت میں کلالۃ کو کسی طرح مرنے والے کے لیے اسم صفت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ تغیر جت قاطع ہے کہ قرآن مجید نے یہ لفظ یہاں پہلے معنی میں، یعنی اس شخص کے لیے جس کے پیچھے اولاد اور والد، دونوں میں سے کوئی نہ ہو، استعمال نہیں کیا ہے۔

اب رہے دوسرے اور تیسرے معنی تو ان میں سے جو بھی مراد لیے جائیں، آیت کا مدعا چونکہ ایک ہی رہتا ہے، اس لیے ترجیح محض حسن تالیف کے لحاظ سے ہوگی۔

چنانچہ آیت میں یورث ہمارے نزدیک، باب افعال سے بنی للمفعول ہے۔ کلالۃ اس سے مفعول لہ ہے۔ کان یہاں ناقصہ ہے اور یورث اس کی خبر واقع ہوا ہے۔ رجل او امرأۃ، کان کے لیے اسم ہیں۔ اس تالیف کی رو سے اس کا ترجمہ یہ ہوگا:

”اور اگر کسی مرد یا عورت کو اس کے کلامہ تعلق کی بنا پر وارث بنایا جاتا ہے۔“

وارث بنانے کا اختیار، ظاہر ہے کہ مرنے والے ہی کو ہوگا اور یورث کا دوسرا مفعول چونکہ یہاں بیان نہیں ہوا، اس وجہ سے عربیت کی رو سے اس کے معنی اس سیاق میں یہی ہو سکتے ہیں کہ ان وارثوں کے علاوہ یا ان کے بعد یا ان کی عدم موجودگی میں ترکے کا وارث بنادیا جاتا ہے جن کے حصے اوپر بیان ہوئے ہیں۔

’وله اخ او اخت فلکل واحد منهما السدس، فان كانوا اكثر من ذلك فهم شركاء فی الثلث، من بعد وصیة یوصی بها او دین، یعنی ایک ہی رشتہ کے متعلقین میں سے اگر کسی ایک مرد یا عورت کو وارث بنایا جاتا ہے تو جس کو وارث بنایا جائے گا، اس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو اس مال کا چھٹا حصہ جس کا اسے وارث بنایا گیا ہے، اس کے بھائی یا بہن کو دیا جائے گا اور اگر اس کے بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو وہ سب ایک تہائی میں برابر کے شریک ہوں گے۔ اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ باقی ۵/۶ یا دو تہائی اس مرد یا عورت کو دیا جائے گا جسے وارث بنایا گیا ہے۔ ہم اگر یہ کہیں کہ — ”زید نے اس رقم کا وارث آپ کے بیٹے کو بنایا ہے، لیکن اس کا کوئی بھائی ہو تو ایک تہائی کا حق دار وہ ہوگا“ — تو اس جملے کا مطلب ہر شخص یہی سمجھے گا کہ بھائی کا حصہ دینے کے بعد باقی روپیہ اس بیٹے کو دیا جائے گا جسے رقم کا وارث بنایا گیا ہے۔

قرآن مجید کی یہ ہدایت بڑی حکمت پر مبنی ہے۔ مرنے والا کلالہ رشتہ داروں میں سے اپنے کسی بھائی، بہن، ماموں، پھوپھی یا چچا وغیرہ کو وارث بنا سکتا ہے۔ لیکن، ظاہر ہے کہ جس بھائی یا ماموں کو وارث بنایا جائے گا، مرنے والے کے بھائی اور ماموں اس کے علاوہ بھی ہو سکتے ہیں۔ یہی معاملہ چچا، پھوپھی اور خالہ وغیرہ کا ہے۔ کوئی شخص اپنے ذاتی رجحان کی بنا پر کسی ایک ماموں یا پھوپھی کو ترجیح دے سکتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو پسند نہیں فرمایا کہ ایک ہی رشتہ کے دوسرے متعلقین بالکل محروم کر دیے جائیں۔ چنانچہ اس کے لیے یہ ہدایت فرمائی کہ کوئی شخص اگر، مثال کے طور پر، اپنے چچا زید کو باقی ترکے کا وارث بنا دیتا ہے اور اس کے چچا عثمان اور احمد بھی ہیں تو ترکے کے جس حصے کا وارث زید کو بنایا گیا ہے، اس کا ایک تہائی عثمان اور احمد میں تقسیم کرنے کے بعد باقی ترکہ زید کو دیا جائے گا۔

’غیر مضار، وصیۃ من اللہ، واللہ علیم حلیم‘، آیت کے آخر میں یہ الفاظ اس تنبیہ کے لیے آئے ہیں کہ وارث بنانے کا یہ عمل کسی حق دار کے لیے ضرر کا موجب نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے وصیت میں ضرر رسانی کو روکنے کے لیے اصل وارثوں کے حصے خود مقرر فرمادیے ہیں، لیکن آیت کلالہ کی رو سے چونکہ مرنے والا اپنی مرضی سے کسی رشتہ دار کو وارث بنا سکتا ہے، اس لیے یہ حکم بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ اس حق کو استعمال کرتے ہوئے کسی کی حق تلفی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ ہماثما کا مشورہ نہیں ہے، پروردگار عالم کی وصیت ہے۔ اس کا بندہ جانتے بوجھتے کسی حق دار کو محروم کرتا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ اس کے ہر عمل سے باخبر ہے اور اگر بے جا بوجھے اس سے کوتاہی ہو جاتی ہے تو اس کا خالق بردبار ہے، اپنے بندوں کے گناہوں کو معاف کرتا ہے۔ وہ نرم خو ہے، بندوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ اس کے حکموں میں ان کے لیے سہولت ہے، تنگی اور مشقت نہیں ہے۔

۶۔ یَسْتَفْتُونَكَ ، قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ ، اِنْ اَمْرُوْهُ اَهْلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ اُخْتُ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ، وَهُوَ يَرِثُهَا اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَهَا وَلَدٌ ، فَاِنْ كَانَتْ اُنْثٰی فَلَهُمَا الثُّلُثَنِ مِمَّا تَرَكَ ، وَاِنْ كَانُوْا اِخْوَةً رِّجَالًا وَنِسَاءً فَلِلَّذَكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثٰی ، یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰتٰی لَكُمْ اَنْ تَصِلُوْا ، وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۔ (النساء: ۴: ۱۷)

”لوگ تم سے فتویٰ پوچھتے ہیں، کہو: اللہ تمہیں کلالہ وارثوں کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے: اگر کوئی شخص بے اولاد مر جائے اور اس کی ایک بہن ہی ہو تو اس کے لیے ترکے کا نصف ہے اور اگر بہن بے اولاد مرے تو بھائی اس کا وارث ہوگا اور بہنیں اگر دو ہوں تو اس کے ترکے میں سے دو تہائی پائیں گی۔ اگر کئی بھائی بہن، مرد عورتیں ہوں تو مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہوگا۔ اللہ تمہارے لیے وضاحت کرتا ہے تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔“

اس سے پہلے ’ان کان رجل یورث کلالۃ کی جو تاویل اوپر بیان ہوئی ہے، اس کی رو سے چونکہ بہن بھائی، چچا

ماموں، خالہ پھوپھی وغیرہ سب کلالہ ہیں اور مورث ان میں سے جس کو چاہے ترکے کا وارث بنا سکتا ہے، اس لیے ہو سکتا تھا کہ وہ کسی چچا ماموں یا خالہ پھوپھی وغیرہ کو اپنے بھائی بہنوں پر ترجیح دے۔ مرنے والے کے اولاد ہو تو یہ صورت ہر لحاظ سے مناسب ہے، لیکن مورث بے اولاد ہو اور اس کے بھائی بہن ہوں تو یہ اختیار قابل اعتراض ٹھہرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اولاد کے بعد باقی سب قرابت مندوں میں بھائی بہن ہی اقرب ہیں۔ عقل تقاضا کرتی ہے کہ اس صورت میں ترکے کا بڑا حصہ انھیں ملنا چاہیے۔ اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ بہن بھائی ہوں تو والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملے گا۔ یہ حصہ چونکہ وہی ہے جو انھیں اولاد کی موجودگی میں ملتا ہے، اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت میں بھی کیا مرنے والے کو یہ اختیار ہے کہ وہ چاہے تو بھائی بہنوں کو وارث بنائے اور چاہے تو انھیں محروم کر دے؟ ہم نے آیات کی شرح کرتے ہوئے اوپر ایک جگہ لکھا ہے کہ اسلوب بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ اولاد کی غیر موجودگی میں میت کے وارث اس کے بھائی بہن ہیں، لیکن اسلوب بیان کی یہ دلالت، ظاہر ہے کہ دلالت الفاظ کی طرح ہر احتمال سے خالی نہیں ہے کہ اس مسئلے پر بحث کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اولاد موجود نہ ہو تو بھائی بہنوں کے بارے میں یہ سوال آج بھی پیدا ہو سکتا ہے اور عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی پیدا ہوا۔ جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

یقول: دخل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وانا مریض، لا اعقل ، فتوضاء فصبوا علی من وضوئہ فعقلت ، فقلت: یا رسول اللہ، انما یرثنی کلالۃ ، فنزلت آیۃ المیراث ۔ (مسلم، رقم ۱۶۱۶)

وہ فرماتے ہیں: میں بیمار تھا اور مجھ پر بے ہوشی کا غلبہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے۔ آپ نے وضو کیا تو لوگوں نے آپ کے وضو کے پانی سے میرے اوپر چھینٹا دیا۔ مجھے ہوش آیا تو میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول، میرے وارث صرف کلالہ ہیں تو اس پر آیت میراث نازل ہوئی۔“

اس حدیث کے الفاظ: 'انما یرثنی کلالۃ فنزلت آیۃ المیراث' سے یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ سوال کلالہ رشتہ داروں میں سے بالخصوص بھائی بہنوں کی میراث کے بارے میں تھا اور سورہ نساء کی یہ آخری آیت اسی استفتاء کے جواب میں نازل ہوئی ہے۔

قرآن کا ایک خاص اسلوب یہ ہے کہ اس میں سوالات نہایت اجمال کے ساتھ نقل ہوتے ہیں۔ چنانچہ سوال کی نوعیت، اس کا موقع محل اور اطراف وجوانب بالعموم اس جواب ہی سے واضح ہوتے ہیں جو اس کے بعد قرآن دیتا ہے۔ اس چیز کو ملحوظ

۴۲ روایتوں میں وضاحت ہے کہ آیت میراث سے مراد یہاں سورہ نساء کی یہی آخری آیت ہے جس میں بھائی بہنوں کے حصے بیان ہوئے ہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی بعض روایتوں میں بہ صراحت بیان ہوئی ہے کہ ان کے وارثوں میں صرف بہنیں ہی تھیں۔

نہ رکھنے کی وجہ سے لوگوں کو قتل اللہ یفتیکم فی الکلالۃ کی تاویل میں بڑی الجھنیں پیش آئی ہیں، دراصل حالیکہ یہاں بھی سوال کو اگر جواب کے لحاظ سے دیکھا جائے تو متکلم کا منشا بغیر کسی ابہام کے واضح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس میں اگر غور کیجیے تو وہی اسلوب ہے جو یو صیکم اللہ فی اولادکم میں ہے۔ وہاں وصیت میت کی وارث اولاد کے بارے میں ہے اور یہاں فتویٰ میت کے وارث کلالہ رشتہ داروں کے بارے میں ہے۔ لفظ کلالۃ پر الف لام دلیل ہے کہ سوال کلالہ وارثوں میں سے کچھ مخصوص اقربا سے متعلق ہے اور جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقربا میت کے بھائی بہن ہیں۔ تمام کلالہ رشتہ داروں، مثلاً چچا ماموں، بھائی بہن، خالہ پھوپھی میں سے کسی کو وارث بنادینے کی اجازت آیات میراث میں بیان ہو چکی ہے۔ یہاں عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ یہ چیز ملحوظ رہے تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا: کہہ دو، اللہ تمہیں کلالہ رشتہ داروں میں سے بھائی بہنوں کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔ اس اسلوب کی نظیر سورہ بقرہ کی آیت یُسئِلُوْكَ عَنِ الْاَهْلِۃ میں موجود ہے۔

’ان امرؤ هلك ليس له ولد‘، یہ بھائی بہنوں کے میراث پانے کے لیے اسی طریقے پر شرط ہے، جس طرح ’فان لم یکن له ولد وورثه ابواه‘ میں ہے۔ وہاں معنی یہ ہیں کہ میت بے اولاد ہو اور ماں باپ ہی وارث ہوں تو ان کا حصہ یہ ہوگا اور یہاں مفہوم یہ ہے کہ مرنے والے کے اولاد نہ ہو اور اس کے بھائی بہن ہوں تو ان کا حصہ اس طرح ہے۔ اس شرط سے واضح ہے کہ بھائی بہن صرف اولاد کی غیر موجودگی میں وارث ہوتے ہیں۔ اولاد موجود ہو تو میت کے ترکہ میں ان کا کوئی حصہ مقرر نہیں ہے، الا یہ کہ مرنے والا نساء کی آیت ۱۲ میں کلالہ کے حکم عام کے تحت ان میں سے کسی کو وارث بنادے۔

بھائی بہنوں کے جو حصے یہاں بیان ہوئے ہیں ان میں اور اولاد کے حصوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ’ان كانوا اخوة رجالا ونساء فللذکر مثل حظ الانثیین‘ کا اسلوب دلیل ہے کہ یہ حصے بھی والدین اور احاد الزوجین کا حصہ دینے کے بعد باقی ترکے میں سے دیے جائیں گے۔ اس کے دلائل ہم اولاد کے حصوں کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کر چکے ہیں۔ چنانچہ ترکے کا جو حصہ بھائی بہنوں میں تقسیم کیا جائے گا، میت کی صرف بہنیں ہی ہوں تو قرآن کی ہدایت کے مطابق، انھیں بھی اسی کا دو تہائی اور اسی کا نصف ادا ہوگا۔

یہ بات، جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا ہے، آیت ۱۲، ۱۱ سے بھی واضح تھی کہ اولاد کی عدم موجودگی میں بھائی بہن اس کے قائم مقام ہیں، لیکن نساء کی اس آیت تبیین نے اسے بالفاظ صریح بیان کر دیا ہے۔ وہاں ممکن تھا کہ اسلوب بیان کی دلالت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ غلطی میں پڑ جاتے۔ اس وضاحت کے بعد یہ احتمال باقی نہیں رہا۔ چنانچہ فرمایا ہے: یبیین اللہ لکم ان تضلوا، واللہ بکل شیء علیم۔